*محمد ذوالفقار علی رانا

مولانا اصغر علی روحیؒ

(سوانح حیات اور علمی و دینی خدمات)

۱۴ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو پنجاب یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا - لیکن اورینٹل کالج اس سے کئی سال پہلے وجود میں آ چکا تھا - اس وقت اورینٹل کالج ، گورنمنٹ کالج کی عمارت میں قائم تھا - لیکن جوں جوں گورنمنٹ کالج کے طلبہ کی تعداد بڑھتی گئی اس کے ساتھ ساتھ عمارت کا بہت سا حصہ اورینٹل کالج کے قبضے سے نکل گیا - اور آخرکار یونیورسٹی ہال کے متصلہ کمروں میں منتقل ہو گیا - ڈاکٹر جی ، ڈبلیو ، لائٹنر اس وقت اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج دونوں کے پرنسپل تھے - وہ برعظیم کے ہمدرد راہنما ، مستشرق ، مفکر اور ماہر تعلیم شخص تھے - اورینٹل کالج کو چلانے کے لیے ڈاکٹر لائٹنر نے عربی ، فارسی اور سنسکرت کے ملک میں چوٹی کے قابل اور مشہور اساتذہ کو ان تینوں شعبوں کی صدارت سے نوازا - چنانچہ عربی میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے ساتھ لمبی چوڑی خط و کتابت کے بعد انہیں لاہور تشریف لانے پر رضامند کیا گیا - اور وہ پہلے قابل ذکر شعبہ عربی کے صدر تھے، جو ۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۷ء تک اس کالج سے وابستہ رہے - وہ اورینٹل کالج کی عربی کی جماعتوں کے علاوہ گورنمنٹ کالج کی جماعتوں کو بھی درس دیتے تھے - وہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد تھے اور مولانا امام بخش صہبائی، حکیم مؤمن خان مؤمن، مرزا اسداللہ خان غالب اور خاقانیٔ ہند ابراہیم ذوق کی شعری اور ادبی محفلوں میں شریک رہے - انھوں نے دلی کے ایک نامور طبیب سے طب کی کتابیں بھی پڑھیں - کچھ عرصہ تک رام پور اور لکھنؤ کے تعلیمی مرکزوں میں درس و تدریس کرتے رہے - فارغ التحصیل ہونے کے بعد دلی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا - ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں دلی سے نکلے اور کچھ عرصہ تک سہارنپور میں طب پر گزر اوقات کرتے رہے ، پھر علی گڑھ چلے گئے، جہاں عربی کی چند کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا - ۱۸۷۰ء کے شروع میں ڈاکٹر لائٹنر نے ان کی خدمات اورینٹل کالج کے لیے حاصل کر لیں -

مولانا فیض الحسنؒ کی علمی و تدریسی شہرت مختلف اطراف ملک میں پہنچنے لگی اور تشنگان علم اپنی پیاس بجھانے کے لیے لاہور کا رخ کرنے لگے - لاہور میں مولانا فیض الحسنؒ کا قیام بھاٹی دروازہ کے اندر بازار حکیماں میں رہا - تعطیلات

---

*ریسرچ سکالر، شعبہ عربی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

گرما میں وہ عموماً سہارنپور چلے جاتے تھے - آخر ۶ فروری ۱۸۸۷ء کو مولانا فیض الحسنؒ نے لاہور ہی میں وفات پائی اور ان کی نعش سہارنپور لے جائی گئی - اور وہ وہیں دفن ہوئے - عربی علوم و ادبیات کی جس شمع کو مولانا فیض الحسنؒ نے اورینٹل کالج میں روشن کیا اس سے دور دور کے طالبان صادق نے اکتساب فیض کیا - مثلاً مولانا شبلی نعمانیؒ، پیر جماعت علی شاہ علی پوریؒ، پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ اور مولانا اصغر علی روحیؒ وغیرہم -

اس مقالے میں صرف مؤخرالذکر بزرگ یعنی مولانا اصغر علی روحیؒ کے مختصر حالات اور علمی و ادبی کارناموں کا ذکر کرنا مدنظر ہے، جو ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۲ء تک اورینٹل کالج کے طالب علم رہے - اور بعد میں کچھ عرصہ کے لیے وہیں عربی کی تدریس بھی کرتے رہے - اس کے بعد انجمن حمایت اسلام نے ان کی خدمات اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) کے لیے حاصل کر لیں -

خاندان اور وطن

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی شخص کے مذاق اور ذوق کی تشکیل و تکمیل اور اس کے فطری جوہر چمکانے، بلکہ اس کی زندگی کا رخ متعین کرنے میں اس کے خاندان اور آباؤ اجداد کا اثر نہایت اہم ہے - اس اصول کا انکار ایک امر بدیہی کا انکار ہے - مولانا اصغر علی روحی کے خاندان کا بقدر ضرورت مختصراً تعارف یہ ہے کہ وہ راجپوت نسل سے تھے، اور ان کا شجرۂ نسب ان کے خاندانی کتب خانہ کے مسودات میں یوں ملتا ہے - (مولانا) اصغر علی (روحی) بن قاضی شمس الدین بن پیر بخش بن رکن الدین بن حامد بن عیسیٰ - یہ بتانا مشکل ہے کہ ان بزرگوں میں میاں عیسیٰ یا ان سے بھی پہلے کوئی بزرگ، دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے - کیونکہ اس سے آگے مولانا کے آباؤ اجداد کے متعلق کچھ علم نہیں - مولانا کے اسلاف، ضلع سیالکوٹ[1] کے ایک گاؤں کانبالوالہ سے تعلق رکھتے تھے - مولانا کے والد مرحوم شمس الدین کو دریائے چناب کے پار کے علاقے کا قاضی مقرر کیا گیا اور وہ موجودہ گاؤں کٹھالہ[2] ضلع گجرات میں قیام پذیر ہوئے - انہیں گورنمنٹ کی طرف سے اس گاؤں میں کچھ زرعی زمین دے دی گئی تا کہ انہیں معاش کی طرف سے بے فکری رہے - چنانچہ وہ زمین اب تک ان کے خاندان کے بعض افراد کے نام موجود ہے - مولانا اصغر علی اسی گاؤں کٹھالہ میں (جو دریائے چناب سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ہے) ۱۷ ذی القعدہ ۱۲۸۹ھ بمطابق ۱۶ جنوری ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے - قاضی شمس الدین عربی و فارسی کے ایک جید عالم تھے اور کٹھالہ کے ابتدائی مدرسہ میں استاد اور ایک مسجد کے خطیب اور امام بھی تھے - ان کے ہاں پانچ بیٹے پیدا ہوئے جن کے نام محمد علی، محبوب علی، اکبر علی، اصغر علی اور فضل علی تھے - فضل علی تو بچپن میں ہی انتقال کر گئے

تھے، باقی چاروں بیٹے اپنی طبعی عمر گزار کر فوت ہوئے۔ (مولانا) اصغر علی نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار ہی سے حاصل کی، جنھوں نے بہت سی عربی و فارسی کتب اپنے ذاتی مطالعہ کے لیے نقل کر رکھی تھیں اور وہ اب تک مولانا اصغر علی روحی کے وارثوں کے قبضے میں ہیں۔ یہ کتابیں عقائد، فقہ، صرف و نحو اور علم طب سے متعلق ہیں۔ قاضی شمس الدین نے مولانا اصغر علی کو ان میں سے کچھ کتابیں پڑھائیں، لیکن جیسا کہ دستور ہے، بچے عموماً اپنے گھر کے افراد سے بہت کم تعلیم و تعلم میں استفادہ کرتے ہیں کیونکہ ان کے اہل خانہ کو ان سے محبت ہوتی ہے، اس لیے تعلیم و تعلم کا باقاعدہ سلسلہ قائم نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں (مولانا) اصغر علی ۶ یا ۷ سال کی عمر میں تھے کہ قاضی شمس الدین کا انتقال ہو گیا اور زیادہ دیر تک (مولانا) اصغر علی ان سے استفادہ نہ کر سکے۔ قاضی شمس الدین کی وفات کے بعد (مولانا) اصغر علی کو مزید تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ انھی دنوں اورینٹل کالج لاہور کی شہرت پنجاب کے مختلف اضلاع میں پھیل چکی تھی۔ (مولانا) اصغر علی نے مختلف لوگوں کی زبان سے اس کالج کا ذکر سن کر لاہور آنے کا شوق اپنی والدہ پر ظاہر کیا۔ چونکہ والدہ کو بچوں خصوصاً چھوٹے بچوں سے بہت محبت ہوتی ہے اس لیے وہ (مولانا) اصغر علی کو لاہور بھیجنے پر رضا مند نہیں ہوتی تھیں۔ (مولانا) اصغر علی بار بار والدہ سے اجازت چاہتے رہے اور آخر صرف ان کی خوشنودی کی خاطر مجبوراً اجازت دے دی۔

تعلیمی کوائف

آخرکار ۱۸۸۱ء میں (مولانا) اصغر علی لاہور آ گئے۔ اس وقت ان کی عمر آٹھ نو سال کے قریب تھی۔ لاہور میں ان کا کوئی عزیز یا واقف کار موجود نہ تھا۔ لیکن (مولانا) اصغر علی بچپن سے ہی نماز کے سخت پابند تھے۔ چنانچہ ایک دن انھوں نے لاہور میں لوہاری منڈی کی مسجد پٹولیاں والی میں عصر کی نماز پڑھی، وہاں ایک نابینا حافظ صاحب جن کا نام عبدالوہاب تھا، صرف و نحو کا درس بچوں کو دیا کرتے تھے۔ نماز سے فراغت کے بعد (مولانا) اصغر علی، حافظ صاحب کی خدمت میں بیٹھ گئے اور لاہور میں اپنے آنے، اور اپنے علمی شوق کا ذکر کیا۔ حافظ صاحب نے صرف و نحو کی کچھ ابتدائی باتیں (مولانا) اصغر علی سے پوچھیں اور ان کا صحیح جواب پا کر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اپنی شاگردی میں انھیں قبول کر لیا۔ حافظ صاحب نے (مولانا) اصغر علی سے طعام و قیام کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ میں ابھی لاہور میں نووارد ہوں اور ابھی تک کوئی مستقل انتظام نہیں ہے۔ حافظ صاحب نے انھیں مسجد ہی میں ٹھہرنے کی

اجازت دے دی اور کھانے وغیرہ کا بھی بندوبست کر دیا ۔ اس پر (مولانا) اصغر علی بہت خوش ہوئے۔ وہ حافظ صاحب کے درس میں باقاعدہ شریک ہونے لگے اور جب حافظ صاحب آرام کرنے لگتے تو (مولانا) اصغر علی انھیں دباتے رہتے ۔ حافظ صاحب نے مولانا کو خود ہی یہ مشورہ دیا کہ بہتر ہوگا کہ وہ اورینٹل کالج میں داخلہ لے لیں ۔ مولانا کے پاس سوائے اس ڈیڑھ روپیہ کے جو رخصت کے وقت انھیں والدہ نے دیا تھا کچھ بھی نہ تھا ۔ بلکہ اس ڈیڑھ روپیہ میں سے بھی ریل کا کچھ کرایہ ادا کرنے کے بعد ایک روپیہ کے قریب باقی رہ گیا تھا ۔ مولانا نے کالج میں داخل ہوکر معافیٔ فیس کی درخواست دی جو منظور ہو گئی ۔ اس لیے فیس وغیرہ کے فکر سے مولانا کو اطمینان ہو گیا ۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء میں انھوں نے اورینٹل کالج میں داخل رہ کر ''منشی'' کا امتحان پاس کیا ۔ اس کے بعد اورینٹل کالج میں داخل رہ کر انھوں نے مندرجہ ذیل امتحانات بالترتیب پاس کیے :

۱۸۸۳	منشی عالم
۱۸۸۴	مولوی
۱۸۸۵	انٹرنس (اورینٹل فیکلٹی)
۱۸۸۶	منشی فاضل
۱۸۸۷	ایف ۔ او ۔ ایل
۱۸۸۸	انٹرمیڈیٹ (اورینٹل فیکلٹی)
۱۸۸۹	مولوی عالم (بطور پرائیویٹ امیدوار)
۱۸۹۰	بی ۔ او ۔ ایل (اورینٹل کالج)
۱۸۹۱	مولوی فاضل
۱۸۹۲	ایم ۔ او ۔ ایل (اورینٹل کالج)

مندرجہ بالا تمام امتحانات میں انھوں نے امتیازی حیثیت حاصل کی ۔ چنانچہ بی ۔ او ۔ ایل ، مولوی فاضل، مولوی عالم اور منشی فاضل کے امتحانات میں یونیورسٹی میں اول آئے۔[۳] اس طرح گویا مولانا نے ۱۸۸۱ء سے ۱۸۹۲ء تک ۱۱ سال کے عرصہ میں ۱۱ امتحانات نمایاں کامیابی کے ساتھ پاس کیے ۔ اور کوئی سال خالی نہ جانے دیا ۔ مختلف امتحانات کے نتیجے پر انھیں یونیورسٹی کی طرف سے انعام کے طور پر کچھ کتابیں بھی دی جاتی رہیں ۔ مثلاً دیوان حسان ، حماسہ ابی تمام اور احیاء العلوم للغزالی وغیرہ ، یہ کتابیں اب تک اہل خاندان کے پاس موجود ہیں ۔ اور مولانا کے اخلاف کے لیے خون گرمانے اور تحصیل علم کا جذبہٗ شوق بڑھانے کا کام دیتی رہتی ہیں ۔

اساتذہ

اورینٹل کالج میں جن اساتذۂ کرام سے مولانا نے استفادہ کیا۔ ان میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں :

۱- مولوی محمد دین فوق ۔
۲- مولوی مفتی عبداللہ ٹونکی ۔
۳- مولوی عبدالحکیم کلانوری ۔
۴- مولوی غضنفر علی ۔
۵- مولوی غلام قادر بھیروی ۔
۶- مولانا فیض الحسن سہارنپوری ۔
۷- مولوی قاضی ظفر دین

رحمہم اللہ تعالیٰ ۔ علم حدیث کے لیے مولانا نے مشہور عالم مولانا نذیر حسین دہلوی کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ۔

ان کے ہم سبق احباب میں مولوی لطافت حسین ، مولوی میراں بخش اور مولوی محمد دین کے نام دستیاب ہیں ۔

ملازمت

مولوی اصغر علی صاحب جیسا کہ بیان ہوا تقریباً ہر امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کیا کرتے تھے ۔ اس لیے انھیں یونیورسٹی کی طرف سے ہمیشہ وظیفہ ملتا رہا ۔ وظیفے کے علاوہ وہ پرائیویٹ طور پر بعض امیدواروں کو تدریس کرکے بھی کچھ آمدنی پیدا کیا کرتے تھے ۔ اس وقت یہ دستور تھا کہ جو امیدوار مولوی فاضل میں اول آتا اس کو منشی کی کلاس کا استاد بنا دیا جاتا ۔ اس طرح مولانا منشی کی کلاس کو ہفتہ میں دو بار پڑھاتے تھے جس کے معاوضے میں انھیں یونیورسٹی سے ۳۳ روپے ماہوار ملتے تھے، یہ ۳۳ روپے آپ گاؤں میں اپنی بیوہ والدہ کو بھیج دیا کرتے تھے ۔

آخرکار ۱۸۹۲ء میں فارغ التحصیل ہوکر مولانا کو اورینٹل کالج میں ہی استاد کے طور پر متعین کیا گیا ۔ لیکن چند ماہ گزرنے کے بعد جب مولانا تعطیلات گرما میں اپنے وطن کٹھالہ گئے ہوئے تھے تو انجمن حمایت اسلام کی طرف سے مولانا کو اسلامیہ ہائی سکول، شیرانوالہ دروازہ میں ملازمت کی پیشکش کی گئی اور اس مضمون کا ایک خط انھیں موصول ہوا ۔ مولانا نے اس پیشکش کو قبول کر لیا اور تعطیلات گرما کے بعد ملازمت کے لیے لاہور آ گئے ۔ کچھ عرصہ بعد شیرانوالہ سکول میں ایف ۔ اے کی کلاسیں شروع کرنے کی تجویز ہوئی ۔ جگہ کی تنگی کی وجہ سے کالج کی کلاسیں موری دروازہ کے اندر راجہ پٹیالہ کی حویلی میں منتقل کر دی گئیں ۔ اور مولانا کو بھی ایف ۔ اے کی کلاسوں کے ساتھ کالج کے

حصہ میں منتقل کر دیا گیا - پھر کالج جہاں جہاں منتقل ہوتا رہا مولانا بھی اس کے ساتھ ساتھ وہیں منتقل ہوتے رہے - حتیٰ کہ سب سے آخر ریلوے روڈ والی عمارت میں ایف - اے، بی - اے اور ایم - اے کی کلاسوں کو ۱۹۳۱ء کے آخر تک پڑھاتے رہے -

تبصرہ

چونکہ مولانا اصغر علی روحی کی طبیعت میں حصول علم اور اعلیٰ تعلیم کا شوق ہمیشہ چٹکیاں لیتا رہتا تھا - اور کٹھالہ کے دیہاتی ماحول میں اسے پورا کرنے کے ذرائع اور مواقع موجود نہ تھے اس لیے وطن کو چھوڑ کر صرف ڈیڑھ روپیہ لے کر لاہور میں آ گئے جو آج کی طرح اس وقت بھی تعلیم و تعلم کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا - اندازہ کرنا چاہیے کہ ایک غریب خاندان کا یتیم بچہ ایک بالکل اجنبی شہر میں جہاں اس کا کوئی عزیز یا رشتہ دار یا مونس و غم خوار نہ ہو، چلا آئے تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہے - لیکن بقول غالب :

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

مولانا کی مستقل مزاجی ، عرق ریزی اور ہمت نے نہ صرف انہیں خاطر خواہ کامیابی سے سرفراز کیا بلکہ ان کی آئندہ نسل کے لیے ترقی کی راہ ہموار کر کے اس کی تقدیر کو بدل دیا - وہ اکثر اپنے ان دنوں کا تذکرہ اپنے بچوں کے سامنے کرتے رہتے تا کہ وہ بھی اپنی زندگی میں جد و جہد اور سعیٔ پیہم کو اپنا شعار بنائیں - اور اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہوں کہ انہیں اس قسم کے صبر آزما مراحل سے گزرنا نہیں پڑا - سچ ہے ان اللہ لا یضیع اجر العاملین -

طریقۂ تعلیم

درس و تدریس میں استاد اور شاگرد کا رشتہ نہایت مقدس اور مربوط سمجھا جاتا ہے - یہ رشتہ جتنا گہرا ہو اتنا ہی دور رس نتائج پیدا کرتا ہے - اساتذۂ قدیم کی طرح مولانا اصغر علی بھی اپنے شاگردوں سے مشفقانہ اور پدرانہ سلوک کو مد نظر رکھتے - اور اپنے بچوں کی طرح انہیں پیار بھی کرتے اور ضرورت کے وقت کان بھی کھینچتے - بالخصوص جو طالب علم زیادہ قابل اور تعلیم کے شوقین نظر آتے ان کی بہت قدر کرتے - ہر طالب علم بھی سمجھتا کہ مولانا کے دل میں میری محبت سب سے زیادہ ہے - ہونہار اور ذہین طلبا کی وہ مالی مدد بھی کرتے رہتے - جماعت میں درسی کتب پڑھاتے وقت بالعموم کتاب سامنے نہیں رکھتے تھے - بلکہ طالب علموں سے کہتے کہ وہ باری باری پڑھیں - آپ کتاب دیکھے بغیر

ترجمہ کرتے ۔ عبارت کا مطلب ذہن نشین کرتے ۔ آپ جہیرالصوت اور با رعب لہجہ کے مالک تھے ۔ تدریس کے دوران میں اگر ضرورت پڑتی تو اپنے درس کو عربی، فارسی اور پنجابی اشعار سے دلچسپ اور مرغوب بنا دیتے تھے ۔ ان کا لیکچر پرمغز اور معلومات سے مزین ہوتا ۔ آپ یہ کوشش کرتے تھے کہ طلبا صرف کتب نصاب تک محدود نہ رہیں بلکہ وسعت مطالعہ اور واقفیت عامہ کا جذبہ اپنے اندر پیدا کریں ۔ وہ ایک ایک لفظ کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرماتے ۔ ایک دفعہ ان کے اپنے ایک بیٹے نے جب بی ۔ اے کا امتحان دینا تھا تو عربی کی کتاب پڑھنی شروع کی ۔ مولانا نے اپنے معمول کے مطابق پڑھانا شروع کیا ۔ لیکن ایک ایک فقرے پر چونکہ کافی وقت صرف ہوتا تھا اس لیے بیٹے نے جھنجھلا کر کہا : چونکہ وقت کم ہے اس لیے اتنی لمبی چوڑی تشریح نہ فرمائیں ۔ یہ سن کر آپ طیش میں آ گئے اور فرمایا کہ میں نے نہ خود اس طرح پڑھا ہے اور نہ اس طرح پڑھا سکتا ہوں اٹھ جاؤ، کسی اور سے جا کر پڑھ لو ۔ میرے نزدیک جو بی ۔ اے تم پاس کروگے اس کا مطلب ہوگا Big Ass ۔ اسی طرح ان کے بڑے صاحبزادے فضل حق ایک دفعہ ان سے سبق پڑھ رہے تھے ۔ مولانا کسی ضروری کام کے لیے اٹھ کر اندر چلے گئے تو فضل حق صاحب کتاب رکھ کر یہ کہتے کہتے سو گئے ۔ ''میں سو جاؤں یا مصطفیٰ کہتے کہتے'' ان کی آواز مولانا کے کانوں میں پہنچ گئی تھی ۔ تھوڑے عرصہ کے بعد مولانا تشریف لائے اور اس شعر کو یوں مکمل فرمایا اور ساتھ ہی فضل حق صاحب کو کان پکڑ کر بٹھا دیا ۔

ع میں سو جاؤں یا مصطفیٰ کہتے کہتے
کھلے آنکھ صل علیٰ کہتے کہتے

اپنے بچوں کو پڑھانے اور عربی، فارسی میں انہیں قابل بنانے کی طرف انہوں نے خاص توجہ دی ۔ چنانچہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم (پرنسپل اورینٹل کالج) فرماتے ہیں[۴] : اپنے بچوں کو عربی اور فارسی کے اعلیٰ ادب کا تمام نصاب انہوں نے سبقاً سبقاً خود پڑھایا ۔ اپنی کثیر مصروفیتوں اور مشاغل کے باوجود یہ کام وہ پوری توجہ سے اور ایک طویل مدت تک التزام کے ساتھ سرانجام دیتے رہے ۔ اس بارے میں انہوں نے قابل تقلید مثال قائم کی ۔

کالج کے علاوہ بعض ضرورت مند طالب علم مولانا کی خدمت میں ان کے گھر آ کر بھی استفادہ کرتے رہتے ۔ آپ حتی الوسع کسی کو مایوس نہ فرماتے ۔ لیکن چونکہ ان کا زیادہ وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا تھا ۔ اس لیے بعض طلباء کو آپ اپنے آرام کے اوقات میں سے کچھ وقت نکال کر ان کی مدد کرتے ۔ چنانچہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مذکور فرماتے ہیں[۵] :

کالج میں اور گھر پر محاسن و معائب سخن کے پرکھنے پر ہمیشہ زور دیتے تھے - ان سے استفادے کا سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا ، جب میں خود بھی تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گیا اس زمانے میں مختصر المعانی کے مطالعہ کے وقت بعض مقامات پر مجھے اشکالات در پیش تھے - مولانا کی طرف رجوع کیا تو بوجہ کم فرصتی انھوں نے یہ تجویز کیا کہ کالج سے گھر کو واپس جاتے وقت راستے میں وہ ان اشکالات کو رفع کر دیا کریں گے - کالج ان دنوں شیرانوالہ دروازے میں تھا اور وہ بھاٹی دروازے میں رہتے تھے - اس راستے کو طے کرتے وقت ، ان کے ہم رکاب ، کتاب ہاتھ میں لے کر مشکل مقامات پڑھتا جاتا تھا اور وہ ان کو حل کرتے جاتے تھے - بازاروں کی گہما گہمی کسی طرح بھی اس سلسلے میں حارج نہ ہوتی تھی -

اسی طرح مولوی ضیاء محمد (ریٹائرڈ پروفیسر ، فارسی گورنمنٹ کالج ، لائل پور (فیصل آباد)) کہتے ہیں[۶] -

جب میں ایم - اے میں پڑھتا تھا تو محمود شبستری کی ایک کتاب ہمارے کورس میں تھی - لیکن اساتذہ کرام اسے بھاری پتھر سمجھتے تھے ، وہ ہمیشہ کلاس میں ٹرخانے کی کوشش کرتے تھے - یہی اساتذہ چونکہ ممتحن بھی تھے اس لیے کھل کر ان سے کچھ کہا بھی نہ جا سکتا تھا - چنانچہ ہم سب ہم جماعتوں نے سوچا کہ علامہ صاحب سے درخواست کریں - میں ایک دن صبح سویرے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو کہنے لگے خیریت تو ہے ، آج اتنی صبح کیسے آنے ، عرض کیا ! آپ سے ایک ضروری کام تھا - خیریت کا تو ہے ، آپ نے فرمایا - عرض کیا ، محمود شبستری کی فلاں کتاب ہم سب آپ سے پڑھنا چاہتے ہیں - آپ مسکرائے اور فرمایا کہ آپ کے وہ استاد جو اتنی بڑی بڑی تنخواہیں لیتے ہیں ان سے کیوں نہیں کہتے کہ پڑھائیں - میں نے عرض کیا ، وہ تو ہمیں ٹرخا رہے ہیں اسی لیے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ ہماری مشکل آسان کریں - کیونکہ اس کتاب سے سوال بھی لازماً Set ہوتے ہیں - آپ نے فرمایا کہ عصر سے مغرب تک کا وقت میرے پاس فراغت کا ہوتا ہے ، اس وقت آپ سب آ جائیں تو میں پڑھا دوں گا - چنانچہ ہم سب عصر کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور وہ ہمیں پڑھا دیا کرتے تھے -

تلامذہ

جیسا کہ سب کو معلوم ہے اس دور میں مسلمان بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے سارے ملک میں دو ہی ادارے تھے - یعنی اسلامیہ کالج لاہور اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ - تقریباً تمام مشہور سیاستدان ، ادباء ، علماء ، شعراء ، وکلاء ، صحافی الغرض سول اور فوج کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے والے حضرات انھی دو اداروں

کے خوشہ چیں رہے ہوتے تھے۔پنجاب کے اکثر طالب علم اسلامیہ کالج لاہور ہی میں داخلہ حاصل کرنے کو ترجیح دیتے - مولانا مرحوم کے کالج میں تقریباً چالیس سالہ دور ملازمت میں ہزارہا شاگردوں نے ان سے فیض حاصل کیا - جن کی مکمل فہرست بنانا شاید ممکن نہ ہو - لیکن بطور مشتے نمونہ از خروارے چند ایک مشاہیر کے نام بترتیب حروف ھجا حسب ذیل ہیں - جنھوں نے اپنے وقت میں مختلف شعبوں میں امتیاز حاصل کیا :

۱- میاں امیر الدین مدظلہ ، صدر انجمن حمایت اسلام -

۲- جناب بشیر احمد شبلی مرحوم ، ہیڈ ماسٹر، چشتیہ ہائی سکول، لاہور -

۳- آقا بیدار بخت مرحوم ، ایڈووکیٹ پنجاب ہائی کورٹ -

۴- جناب حفیظ اللہ ، ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر، بہاول پور -

۵- جناب حمید نظامی مرحوم ، بانی روزنامہ نوائے وقت -

۶- جناب خورشید محمد مرحوم ، ڈپٹی کمشنر، گجرات -

۷- چوہدری خوشی محمد ناظر مرحوم ، سابق گورنر، ریاست جموں و کشمیر -

۸- خواجہ دل محمد مرحوم ، پرنسپل، اسلامیہ کالج ، ریلوے روڈ ، لاہور -

۹- چوہدری رحمت علی مرحوم ، (جنھوں نے پاکستان کا نام تجویز کیا) -

۱۰- مولوی سراج الدین پال مرحوم ، ایڈووکیٹ پنجاب ہائی کورٹ -

۱۱- شیخ سردار علی ، پروفیسر، ایچی سن کالج ، لاہور -

۱۲- جناب ایس - اے ہارون ، سابق پرنسپل، سنٹرل ٹریننگ کالج ، لاہور -

۱۳- خلیفہ شجاع الدین مرحوم ، بیرسٹر، پنجاب ہائی کورٹ -

۱۴- میاں شمس الدین ، ریٹائرڈ پروفیسر، ایف - سی کالج ، لاہور -

۱۵- میاں شمس الدین مرحوم ، مالک مکتبہ معین الادب، اردو بازار، لاہور -

۱۶- ڈاکٹر صدر الدین مرحوم ، صدر، شعبہ عربی، گورنمنٹ کالج ، لاہور -

۱۷- مولوی ضیاء محمد ، ریٹائرڈ پروفیسر، فارسی، گورنمنٹ کالج ، فیصل آباد -

۱۸- مولوی ظفر اقبال مدظلہ ، ریٹائرڈ رجسٹرار، امتحانات محکمۂ تعلیم پنجاب -

۱۹- جناب عبد البشیر آذری مرحوم ، شعبۂ اسلامیات، پنجاب یونیورسٹی، لاہور -

۲۰- جناب عبدالحمید مرحوم ، ریٹائرڈ چیف پوسٹ ماسٹر، جنرل پوسٹ آفس، لاہور -

۲۱- جناب عبدالرحیم ، ریٹائرڈ ٹیچر، اسلامیہ ہائی سکول، بھاٹی دروازہ ، لاہور -

۲۲- پروفیسر عبدالقیوم ، شعبۂ دائرۃ المعارف ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور -

۲۳- جناب عبدالحمید ، ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز، سرگودھا ۔

۲۴- جناب عبدالمجید سالک مرحوم ، ایڈیٹر، جریدہ انقلاب، لاہور ۔

۲۵- جناب عبدالواحد یوسفی ، ریٹائرڈ سیکشن آفیسر، لاہور ۔

۲۶- جناب عبیدالرحمن ، ریٹائرڈ پرنسپل، اسلامیہ ہائی سکولز، راولپنڈی ۔

۲۷- ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ مرحوم ، صدر، شعبہ عربی، گورنمنٹ کالج و پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ۔

۲۸- ڈاکٹر غلام جیلانی برق ، ریٹائرڈ پروفیسر، فارسی ۔

۲۹- مولانا غلام رسول مہر مرحوم ، ایڈیٹر انقلاب، لاہور ۔

۳۰- ملک غلام محمد مرحوم ، سابق گورنر جنرل پاکستان ۔

۳۱- چوہدری فتح محمد بٹالوی مرحوم ، سابق سیکرٹری، میونسپل کمیٹی، بٹالہ ۔

۳۲- خان صاحب قاضی فضل حق مرحوم ، صدر، شعبہ فارسی، گورنمنٹ کالج ، لاہور۔

۳۳- شیخ فضل محمد ، ایڈووکیٹ، ساہیوال ۔

۳۴- شیخ فقیر محمد مرحوم ، پروفیسر فارسی، زمیندارہ کالج ، گجرات ۔

۳۵- مولوی کریم بخش مرحوم ، شعبہ عربی، گورنمنٹ کالج ، لاہور ۔

۳۶- خواجہ گلزار احمد ، خواجہ بک ڈپو ، اردو بازار، لاہور ۔

۳۷- سردار محمد ابراہیم ، سابق صدر، آزاد کشمیر ۔

۳۸- مولوی محمد بخش مسلم ، خطیب مسجد مینار والی، لوہاری دروازہ ، لاہور ۔

۳۹- شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی مرحوم ، سابق پرنسپل، طبیہ کالج ، لاہور ۔

۴۰- چوہدری محمد حسین مرحوم ، (علامہ اقبالؒ کے معتمد خاص)، سابق انچارج ، گورنمنٹ پریس، برانچ لاہور ۔

۴۱- جناب محمد حسین ملک ، ریٹائرڈ پرنسپل، کینٹ پبلک سیکنڈری سکول ۔

۴۲- چوہدری محمد خان مرحوم ، ریٹائرڈ ٹیچر، زمیندارہ ہائی سکول، گجرات ۔

۴۳- ملک محمد خان مرحوم ، ریٹائرڈ میجر ۔

۴۴- شیخ محمد دین رضوانی مرحوم ، سابق انسپکٹر محکمہ ریلوے، لاہور ۔

۴۵- مولوی ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم ، ریٹائرڈ پرنسپل، اورینٹل کالج ، لاہور ۔

۴۶- مولوی محمد شفیع مرحوم ، ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول، بھاٹی دروازہ ، لاہور۔

۴۷- چوہدری محمد علی مرحوم ، سابق وزیراعظم پاکستان ۔

۴۸- جناب محمدعلی ملک مرحوم، ریٹائرڈ پروفیسر فارسی، گورنمنٹ کالج، ڈیرہ غازیخان۔

۴۹- جناب محمد نصیر بہابوں مرحوم، مالک قومی کتب خانہ ، ریلوے روڈ، لاہور ۔

۵۰- چوہدری محمد یعقوب ، ریٹائرڈ ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز، سرگودھا ۔

۵۱- جناب مولا بخش خضر تمیمی مرحوم ، ایڈووکیٹ پنجاب ہائی کورٹ ۔

۵۲- سید ناصر حسین رضوی ، ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ جیل، لاہور ۔

۵۳- جناب نذیر نیازی مرحوم ۔

انجمن حمایت اسلام سے مولانا کا تعلق

مولانا مرحوم قریباً ۴۰ سال تک اسلامیہ کالج میں ہی خدمات بجا لاتے رہے ۔ اور انجمن کے اغراض و مقاصد کے مطابق اُن کی ہر طرح امداد کرنے پر کمربستہ رہے ۔ بیرون ملک سے کوئی وفد یا کوئی بڑا شخص آتا تو آپ عموماً اُس کی خدمت میں منظوم سپاسنامہ پیش کرتے ۔ بالخصوص انجمن کے سالانہ جلسوں میں آپ کئی سال تک اپنا کلام سناتے رہے ۔ چنانچہ اسلامیہ کالج کا حبیبیہ ہال جب تعمیر کے پایۂ تکمیل کو پہنچا تو اُس کے افتتاح کے لیے افغانستان کے حاکم امیر حبیب اللہ خاں کو بلایا گیا ۔ مولانا نے اس موقع پر ان کے اعزاز میں فارسی قصیدہ پڑھا جس کو سن کر امیر موصوف نے گراں قدر رقم انجمن کو عطا کی ۔

اسی طرح ایک بار سالانہ جلسہ کے موقع پر نواب بہاولپور تشریف لائے تو مولانا مرحوم نے اپنا منظوم قصیدہ پڑھا اور نواب صاحب نے ایک معقول رقم انجمن کو عطا کی ۔ مولانا تعطیلات گرما میں عموماً پنجاب کے مختلف شہروں کا دورہ کرتے اور جہاں جہاں اُن کے شاگرد یا عقیدت مند موجود ہوتے اُن کی معرفت انجمن کے لیے چندہ کی بڑی بڑی رقمیں فراہم کرکے لایا کرتے تھے ۔ ۱۸۹۲ء میں مولانا ایک وفد کے لیڈر کے طور پر نواب بہاولپور کے دربار میں گئے اور اُن کی خدمت میں اپنا بے نظیر قصیدہ پڑھا ۔ نواب نے از راہ علم پروری چھ سو روپے سالانہ انجمن کو دینا منظور کیا ۔ بعد میں یہ رقم غالباً چار ہزار روپے سالانہ تک بڑھا دی گئی ۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ انھیں علی گڑھ یونیورسٹی اور اسلامیہ کالج پشاور میں ملازمت کے لیے فرمائش کی جاتی رہی لیکن مولانا نے لاہور کی علمی مرکزیت اور وطن سے قریب ہونے کی بنا پر کسی اور پیشکش کو قبول نہ فرمایا

اور انجمن بھی ایسے مخلص ، محنتی اور قابل استاد کو چھوڑنے پر تیار نہ تھی ۔ چنانچہ آپ ماہ دسمبر ۱۹۳۱ء کے آخر تک اسلامیہ کالج میں ہی درس و تدریس کرتے رہے ۔ اس وقت غالباً ان کا مشاہرہ اڑھائی سو یا پونے تین سو تھا ۔

مولانا کی اس قسم کی خدمات کے اعتراف کے طور پر کالج کی کمیٹی نے ایک معقول رقم مولانا کو پنشن کے طور پر دینے کا فیصلہ کیا جو ۱۹۳۲ء کی ابتدا سے مولانا کی وفات تک جو ۱۹۵۴ء میں ہوئی، سہ ماہی وظیفہ کی شکل میں ملتی رہی ۔ انجمن حمایت اسلام جو عوام الناس کے چندے پر گزارہ کرتی تھی اس قسم کی پنشنیں دینے کو برداشت نہیں کر سکتی تھی ۔ مولانا کی دیکھا دیکھی بعد میں کالج کے دوسرے اساتذہ نے بھی بڑی کوشش کی کہ انھیں بھی پنشن دی جائے مگر ارکان انجمن نے ان کی درخواستوں کو درخور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے کہا کہ مولانا کی خدمات منفرد اور بے نظیر ہیں ۔ یہ بات بے شک ایک بہت بڑا اعزاز اور انجمن کی طرف سے ان کی خدمات کے اعتراف کا ایک واضح ثبوت ہے۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء ۔

حلقۂ احباب

مولانا ایک مذہبی راہنما اور کالج میں پروفیسر ہونے کے علاوہ ،مفتی بھی تھے اور خطیب بھی ، مقرر بھی تھے اور مصنف بھی ، صحافی بھی تھے اور شاعر بھی ، صاحب حال بھی تھے اور صاحب قال بھی ۔ اس لیے ان کا دائرۂ احباب بہت وسیع تھا ۔ ان احباب میں بڑے بڑے عہدیدار اور رؤساء بھی شامل تھے مثلاً سر میاں محمد شفیعؒ ، سر شیخ عبدالقادرؒ ، سر میاں فضل حسینؒ سید حبیبؒ ، سر میاں شہاب الدینؒ اور علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ وغیرہ ، یہ سب مولانا کا نہایت احترام کیا کرتے تھے ۔ اسی طرح مولانا ظفر علی خود ان سے ملنے کے لیے تشریف لایا کرتے تھے ۔ ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ سر میاں محمد شفیع کو گورنمنٹ پنجاب کی طرف سے کوئی اعزاز ملا ۔ اس موقع پر سعودی عرب کے فرمانروا نے سر شفیع کو ایک چغہ بطور تحفہ اور تہنیت نامہ ارسال کیا ۔ وہ خط چونکہ عربی زبان میں تھا اس لیے سر شفیع مرحوم نے مولانا کو یاد فرمایا اور اپنے خادم کو موٹر کار دے کر بھیجا تاکہ وہ مولانا کو لے آئے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں بھی والد صاحب کے ساتھ سر شفیع کی کوٹھی پر گیا ۔ دریافت احوال کے بعد سر شفیع نے فرمانروائے عرب کی چھٹی پڑھ کر اس کا مطلب سمجھانے کی فرمائش کی ۔ چنانچہ مولانا نے اس کا خلاصہ سر شفیع کو بتایا ۔ اس کے بعد سر شفیع نے مولانا سے فرمائش کی کہ وہ عربی زبان میں ہی اس کا جواب لکھ دیں اور دو تین روز تک کسی کاتب سے لکھوا کر بھیج دیں ۔ والد صاحب نے وعدہ کر لیا اور گھر واپس آ کر اس خط کا جواب مجھے عربی میں

لکھوایا ۔ پھر شام تک اس پر نظر ثانی کرنے کے بعد ایک کاتب کے حوالے کیا تاکہ وہ ایک خاص قسم کے کاغذ پر لکھ دے ۔ وہ لکھ لایا تو مجھے والد صاحب نے سر شفیع تک پہنچا دینے کا حکم دیا ۔ چنانچہ میں سر شفیع کی کوٹھی پر گیا اور وہ خط اُن تک پہنچا دیا ۔

اسی طرح سر شہاب الدین کو بھی برطانوی حکومت کی طرف سے اعزاز دیے جانے کے موقع پر فارسی میں چند شعر بطور تہنیت لکھ کر مولانا نے روانہ کیے جو اُن کے فارسی دیوان میں موجود ہیں ۔

سر عبدالقادر جو رسالہ مخزن کے ایڈیٹر تھے ۔ مولانا سے فرمائش کرتے رہتے کہ اپنا فارسی کلام مخزن میں طباعت کی خاطر روانہ کریں ۔ چنانچہ اُن کے بعض قصائد اُس دور کے رسالہ مخزن میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔

اسی طرح مولانا ظفر علی اپنے جریدہ زمیندار میں چھاپنے کے لیے مولانا سے اُن کا کلام مانگتے رہتے اور اُن کے کئی قصائد زمیندار اخبار میں چھپتے رہے ۔ اخبار سیاست کے ایڈیٹر مولانا سید حبیب بھی اُن سے فارسی کلام کی فرمائش کرتے رہتے ۔ چنانچہ بعض نظمیں سیاست میں بھی چھپتی رہیں ۔

یہ اُس دور کا ذکر ہے جب ڈاکٹر علامہ اقبال بھاٹی دروازہ کے اندر ہی قیام پذیر تھے اور حکیم احمد شجاع کے بیان کے مطابق وہ اور مولانا اصغر علی دوسرے متعدد شعراء کے ساتھ بھاٹی دروازہ میں ہونے والے مشاعرہ میں آیا کرتے تھے ۔ علامہ ڈاکٹر اقبال اس مشاعرے کے علاوہ مولانا کے ہاں بکثرت آتے جاتے رہتے تھے ۔ انہی دنوں مندرجہ ذیل واقعہ پیش آیا ۔ جو خود علامہ مرحوم نے ان الفاظ میں بیان کیا ۔[۸]

''کچھ عرصہ ہوا ایک دولت مند ، تعلیم یافتہ ، روشن خیال اور کاروباری ہندو ، مولانا اصغر علی صاحب روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کے پاس آیا ۔ اس نے مولانا سے درخواست کی ''آپ ایک الگ کمرے میں آ جائیں''۔ مولانا اس کی درخواست کے مطابق تنہا کمرے میں چلے آئے اور فرمایا '' کیا ارشاد ہے ؟'' نووارد نے کہا ! مولانا ! مجھے مسلمان بنائیے ۔ مولانا نے اسلام کی تلقین کی ۔ خدا کی وحدت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار لیا اور پوچھا کہ آپ اس طرح تنہائی میں کیوں داخل اسلام ہوئے ہیں ۔ نووارد نے بیان کیا ۔ ''میں نے کوئی اسلامی کتاب نہیں پڑھی ۔ کسی مسلمان عالم سے اسلام کو نہیں سمجھا لیکن خوش قسمتی سے کئی مرتبہ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں

زیارت ہوئی ہے - اب میں حضور کی محبت میں بے تاب ہوں اور اسلام قبول کرنے پر مجبور ہوں - مولانا نے پوچھا : پھر آپ فیروز پور سے چل کر لاہور کیوں آئے اور کھلے بندوں کیوں اسلام قبول نہ کیا ؟ نووارد نے اس سوال کے جواب میں اپنی تعلیم ، ملازمت ، کاروبار اور جائداد وغیرہ کے حالات مولانا کے سامنے بیان کیے اور کہا - ان حالات کی بنا پر میں اعلان کرنے سے معذور ہوں - لیکن میں آپ کو اپنے اسلام پر گواہ بنانے آیا ہوں - میں اللہ کی وحدت اور حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لاتا ہوں - آپ قیامت کے دن اللہ تعالی کی بارگاہ میں میرے ایمان کی شہادت دیجیے - میری یہ عرصے سے آرزو تھی کہ میں اس دنیا میں کسی ایک مسلمان کو اپنے ایمان کا گواہ بنا لوں - خدا کا شکر ہے کہ آج میری یہ آرزو پوری ہوئی -''

شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم مولانا اصغر علی روحیؒ کے نہ صرف حلقۂ احباب میں شامل تھے بلکہ وہ ان کی علمی بصیرت کے بھی قائل تھے اور انہیں ایک مستند عالم کا درجہ دیتے تھے - چنانچہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :[۹]

ان اشعار کے متعلق جو کچھ آپ کا ارشاد ہے اس سے مولوی اصغر علی روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور اتفاق نہیں کرتے لیکن فی الحال ان پیش کردہ اسناد سے مجھے تسکین نہیں ہوئی - دو چار روز تک نتیجہ عرض کروں گا -'' ایک دوسری روایت[۱۰] کے مطابق علامہ اقبالؒ واضح الفاظ میں ان کی علمی بصیرت و فضیلت کا اقرار کیا کرتے تھے : ''آپ (مولانا روحیؒ) علم کے بحر زخار تھے - - - کبھی کبھی علامہ آپ کے مکان پر تشریف لے جاتے تھے - علامہ فرماتے ہیں کہ محاورۃ پڑھا ہے کہ دریا کوزے میں بند کر دیا گیا ہے مگر جب سے مولانا روحی سے ملاقات ہوئی حقیقتاً معلوم ہوا کہ اس شخص میں علم کا دریا بند ہے - علامہ ان کے علمی کمالات کے معترف تھے''-

تبلیغ اسلام

مولانا شروع میں سنہری مسجد کے قریب محلہ کندی گراں میں رہتے تھے - لیکن اس مکان کا صرف بالائی حصہ آپ کے تصرف میں تھا اور آپ کرایہ دار کے طور پر وہاں مقیم تھے - اس وقت مولانا سنہری مسجد میں قرآن مجید کا درس دیا کرتے تھے - ایک دن اتفاق سے میاں قمر الدین مرحوم رئیس اچھرہ بھی درس سننے کی خاطر حلقہ میں آ بیٹھے انہیں مولانا کی باتیں بہت پسند آئیں اور ان کے درس

کا گہرا نقش اُن کے دل پر جم گیا - وہ پھر کئی بار درس میں شامل ہوتے رہے - اُس وقت میاں قمر الدین مرحوم بھاٹی دروازہ کے محلہ ذیلداراں میں اپنے والد میاں اسمعیل نمبردار مرحوم کے ساتھ مقیم تھے - انہوں نے اپنے والد صاحب سے مولانا کے درس کا ذکر کیا اور مشورہ دیا کہ ہمارے ساتھ والا مکان چونکہ فروخت ہو رہا ہے اس لیے مولانا کو یہ مکان خرید لینے پر آمادہ کیا جائے تاکہ وہ ہمارے محلہ کی مسجد میں درس دے سکیں - اس محلہ کی آبادی دو تین جاہل قوموں مثلاً گوجر ، نیارئیے اور کچھ ارائیں برادری پر مشتمل تھی - میاں اسمعیل کو یہ بات پسند آئی اور انہوں نے میاں قمر الدین سے کہا کہ مولانا سے بات کرکے دیکھ لو اگر وہ آ جائیں تو بہت اچھا ہے - چنانچہ میاں قمر الدین نے مولانا سے بات کی اور مولانا نے کہا کہ میں سوچ کر جواب دوں گا - چند دن کے بعد میاں قمر الدین نے دوبارہ یاد دلایا - مولانا نے کوئی خاص جواب نہ دیا - آخر بار بار کے اصرار پر مولانا نے کسی قدر آمادگی کا اظہار کیا - اسلامیہ کالج میں اُن دنوں چونکہ جمعہ کو رخصت ہوتی تھی اس لیے ایک جمعہ کو میاں قمر الدین صبح سویرے ہی تشریف لے آئے اور مولانا سے کہنے لگے کہ میں گھر کا سامان منتقل کرنے کے لیے یکہ لے آیا ہوں اس لیے آپ تشریف لے چلیں سامان میں خود لے آؤں گا - مولانا حیران رہ گئے اور فرمایا : بندۂ خدا پہلے بات پکی کر لی ہوتی - یہ تم نے کیا کیا - میاں قمر الدین مرحوم نے آخر میدان مار لیا اور مولانا کو اپنے ساتھ والے مکان محلہ ذیلداراں میں لے آئے جو مولانا نے چند دن میں خرید لیا - یہاں مسجد میں جو امام صاحب تھے اُن کا نام میاں قدرت اللہ تھا وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے اور امامت کے علاوہ وہ تمام لاہور شہر کی گوجر برادری کے شادی بیاہ کے موقع پر اُن کے تنبول (نیوتہ) لکھنے کا کام کیا کرتے تھے اور مسجد کے نیچے ہی دکان میں دودھ دہی بیچا کرتے تھے - الغرض انہیں نمازیوں کو با جماعت نماز پڑھانے کا موقع بہت کم ملتا - نمازی آپس میں ایک دوسرے کو آگے کھڑا کر دیا کرتے تھے - جب امام صاحب کو مولانا کے اس محلہ میں آ جانے کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے اور امامت و خطابت کا کام مولانا کے سپرد کر دیا - میاں اسمعیل نمبردار اور میاں قمر الدین نے درس قرآن شروع کرنے کی مولانا سے فرمائش کی اور محلے کے تمام کوائف اُن کو بتائے گئے - یہ گوجر اور نیارئیے کئی قسم کی بدعتوں اور قباحتوں کے مرتکب ہوا کرتے تھے - مثلاً بیاہ شادی کے موقع پر باجے بجانا ، آتش بازی چلانا ، شراب پینا ، جوا کھیلنا اور طوائف سے مجرا کرانا وغیرہ مولانا نے آہستہ آہستہ شفقت و محبت سے اُن کو سمجھابجھا کر راہ راست پر لانے کی کوشش کی - یہ غالباً ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء کا زمانہ تھا اور مولانا ۱۹۵۴ء یعنی اپنی وفات تک اسی مکان میں مقیم رہ کر تبلیغ دین کا فریضہ بجا لاتے رہے - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ مذکورہ بالا تمام قباحتیں محلے سے ختم ہوگئیں اور ہر چھوٹا بڑا مولانا کا بے حد احترام کرنے لگا - چنانچہ اب تک لوگ انہیں یاد کرتے رہتے ہیں - پھر کیا مجال تھی کہ مندرجہ بالا بدعتوں میں

سے کوئی بھی دیکھنے یا سننے میں آتی ۔ ایک دفعہ ایک نیارئیے نے اپنے بچے کی شادی کے موقع پر طوائف سے مجرا کرایا مولانا نے تمام نمازیوں سے کہا کہ اس سے قطع تعلق کر لیں ۔ وہ شخص نماز کا انتہائی پابند تھا ۔ مولانا نے اسے بلایا اور نہایت غصے میں اُس سے مخاطب ہوئے اور کہا افسوس ہے ، تم نمازی ہو کر اس جرم کے مرتکب ہوئے ہو ۔ تمہیں دس روپے جرمانہ کیا جاتا ہے جو مسجد فنڈ میں جمع ہوگا ۔ وہ شخص بہت نادم اور پشیمان ہوا ۔ اس نے جرمانہ ادا کر دیا اور آئندہ کے لیے توبہ کر لی ۔ اس محلے میں مولانا کی تبلیغ کا یہ اثر ہوا کہ تمام غیر شرعی رسوم کے ختم ہو جانے کے ساتھ ساتھ تقریباً سارا محلہ نماز پڑھنے لگا ۔ بعض نے قرآن مجید بھی پڑھ لیا اور حج کے فریضہ سے سبکدوش ہوگئے ۔ لیکن افسوس مولانا کی وفات کے بعد پھر وہی قباحتیں اور بدعتیں لوٹ آئیں ۔ مولانا تبلیغ اسلام کی یہ خدمت بغیر کسی معاوضے یا تنخواہ کے بجا لاتے رہے ۔ وہ سخت مست الفاظ بھی اپنے وعظ میں استعمال کر لیتے کسی کو مجال نہ تھی کہ اُف تک بھی کرتا ۔ حالانکہ اس محلہ میں بڑے بوڑھے لوگ بھی مقیم تھے جو مولانا سے عمر میں بڑے تھے ۔ یہ سب اُن کے خلوص اور بے لوث خدمت کا نتیجہ تھا ۔

اس محلہ کے سرے پر جنڈ کا ایک درخت تھا اور محلہ کی مسجد کو جنڈی والی مسجد کہا کرتے تھے ۔ محلہ کے ساتھ ہی دائیں بائیں ہندوؤں اور سکھوں کی آبادیاں بھی موجود تھیں ۔ ہندو لوگ جنڈ کے اس درخت کی پوجا کیا کرتے ، اس کی جڑوں میں دودھ بہایا کرتے اور ٹونے ٹوٹکے کر کے اس کی شاخوں کے ساتھ باندھا کرتے تھے ۔ مولانا کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ سوچتے رہے کہ اس قسم کی مشرکانہ رسم کو کیسے ختم کیا جائے ۔ آخر ایک دیندار اور مخلص نیارئیے سے انھوں نے مشورہ کیا تو اس نے اس رسم کو ختم کرنے کا ذمہ لے لیا ۔ اس کے طریق کار کا ذکر اس کے بیٹے محمد شفیع کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے'' :

'' ایک اور بات جو قابل ذکر ہے یہ ہے کہ اس گلی کے آخر میں جنڈ کا ایک درخت تھا ۔ چونکہ اس محلہ کے قریب ہی غیرمسلم لوگ بھی آباد تھے مثلاً کوچہ وسطی رام اور محلہ جلوٹیاں وغیرہ ۔ اس لیے وہ لوگ اس درخت کی تعظیم اور پوجا کیا کرتے تھے ۔ مولانا نے میرے والد مرحوم میاں غلام نبی سے فرمایا کہ یہاں اس درخت کی پوجا ہوتی ہے ، اس کا کوئی بندوبست ہونا چاہیے ۔ میرے والد نے جواب دیا کہ اگر آپ حکم دیں تو میں آٹھ دن تک اسے ختم کر سکتا ہوں ۔ مولانا نے فرمایا کہ کسی ایسے طریقے سے کام ہونا چاہیے جس سے فتنہ و فساد رونما نہ ہو ۔ اور جو خلاف قانون بھی نہ ہو ۔ چنانچہ میرے والد صاحب نے ایک رات چپکے سے

اس درخت کی جڑوں میں تیزاب ڈال دیا ۔ جس کی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ سوکھتا گیا ۔ حتیٰ کہ میونسپل کمیٹی نے اسے کٹوا دیا ۔ اور اس کی پوجا خود بخود ختم ہو گئی"۔

مولانا کے درس میں بعض نہایت شوقین اور پڑھے لکھے لوگ بھی شریک ہوا کرتے تھے ۔ چنانچہ مولانا غلام رسول مہر کا بیان ہے[۱۲] :

"مولانا اپنے مکان کے پاس کی مسجد میں روزانہ صبح کی نماز کے بعد قرآن مجید کا درس دیا کرتے تھے ۔ چوہدری محمد حسین مرحوم اس درس میں کبھی کبھی شریک ہوتے تھے ۔ ایک مرتبہ میں بھی گیا تھا ۔ اس روز ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب لعلکم تتقون کی تفسیر فرماتے ہوئے اس حکم کے مصالح ایسے دل نشین انداز میں بیان کیے تھے کہ آج تک یہ واقعہ اور یہ درس ذہن میں اسی طرح تازہ ہے جس طرح سنا تھا"۔

اپنے محلہ کی مسجد کے علاوہ مولانا لاہور میں اور مساجد میں بھی کچھ عرصہ درس دیتے رہے ۔ مثلاً مسجد قاضیاں اندرون موچی دروازہ اور مسجد بکن خاں موچی دروازہ ۔ امرتسر میں ہر سال امام ابو حنیفہؒ کا دن منایا جاتا تھا ۔ آپ وہاں بھی تشریف لے جاتے اور پرمغز تقریر سے لوگوں کو محظوظ کرتے ۔

پنجاب کے بعض دوسرے شہروں میں بھی ان کے مواعظ حسنہ لوگوں کو سننے کا موقع ملتا رہتا ۔ مثلاً فیروز پور ، بٹالہ ، سیالکوٹ اور ایبٹ آباد وغیرہ ۔

چنانچہ مولانا علم الدین سالک مرحوم کا بیان ہے[۱۳] کہ

"ایبٹ آباد میں ایک دفعہ انھوں نے وعظ کیا تھا ۔ میں وہاں گیا تو بیس بائیس برس کے بعد بھی لوگ یاد کرتے تھے ۔ قدیم تعلیم والے کہتے تھے کہ صرف ایک شخص دیکھا ہے جس کی قرآن پر گہری نظر ہے اور جو عربی ادب کا ماہر ہے"۔

اسی طرح سید بدر محی الدین قادری ، سجادہ نشین دربار قادریہ فاضلیہ لکھتے ہیں[۱۴] :

"میرے والد بزرگوار حضرت سید نذر محی الدین صاحب قادری ، سجادہ نشین (بٹالہ شریف) کی خدمت میں آپ کے ایک معزز مخلص عقیدت مند نے جناب اصغر علی صاحب روحی کی تعریف و توصیف کرکے عرض کیا کہ جناب مولانا ممدوح کو دربار قادریہ فاضلیہ کے سالانہ عرس پر تقریر کرنے کے لیے دعوت دی جائے ۔ یہ سالانہ تقریب حضرت غوث اعظم سیدنا سید عبدالقادر جیلانیؒ کا عرس ہے ، جس کو دربار قادریہ فاضلیہ کی قدیمی روایات میں بڑی اہمیت ودیعت ہو چکی ہے ۔ تقریباً تین سو سال سے یہ عرس مبارک

قدسی روایات کے مطابق ادا ہوتا ہے ۔ اس لیے اس عرس مبارک پر تقریر کرنے کے لیے کسی عالم کو بڑی احتیاط سے منتخب کیا جاتا ہے ۔ چنانچہ جناب مولانا ممدوح کو دعوت نامہ تقریر کے لیے بھیجا گیا اور انھوں نے عرس مبارک پر تقریر فرمائی ۔ اور اس کے بعد متواتر کئی سال آپ بٹالہ شریف کے اس عرس مبارک پر تقریر فرماتے رہے ۔

اس کے بعد ایک دفعہ اس رفیع الشان تقریب پر آپ نے تقریر کے اختتام پر تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کہ اس رفیع القدر تقریب پر متواتر کئی سال سے تقریر کرنے سے مجھے فقر کی تجلیات انوار نے فقر سے ایک واضح تعارف عطا کر دیا ہے اور میں اس عنایت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا ۔ یہ فرما چکے تو مولانا ممدوح بہت دیر تک اشکبار رہے اور تقریر ختم ہو گئی" ۔

انجمن حمایت اسلام نے اپنے تعلیمی اداروں میں ابتداء ہی سے دینی تعلیم کا سلسلہ قائم کر رکھا تھا ۔ ہر طالب علم کے لیے دینیات کا مضمون لازمی تھا ۔ مولانا عربی کے علاوہ مختلف جماعتوں کو دینیات بھی پڑھایا کرتے تھے ۔ اس لیے انھیں انگریزی خواں نوجوانوں کے شکوک و شبہات کے ازالے کا موقع ملتا رہتا جو ان کے ذہنوں میں مذہب کے بارے میں پیدا ہوتے تھے ۔ طلبہ درس کے دوران آپ سے مذہب کے بارے میں متعدد سوالات پوچھتے اور آپ ان کا تسلی بخش جواب دیا کرتے ۔ اس طرح کئی مسلمان طالب علم غلط راستے پر گامزن ہونے سے محفوظ رہتے ۔ کالج میں ہر اتوار کو پہلا پیریڈ وعظ و نصیحت (Sermon) کا ہوتا تھا ۔ جس میں تمام اساتذہ و طلبہ کی حاضری لازمی تھی ۔ ایک اتوار مولانا مرحوم اور دوسرے اتوار مولانا محمد عمر خان ٹونکی مرحوم مختلف اسلامی موضوعات پر تقریر کیا کرتے تھے ۔ مولانا کی تقریر عموماً اسلام کے اعتقادی پہلو سے متعلق ہوتی تھی اور مولانا محمد عمر کا لیکچر اسلام کے عملی پہلو یعنی عبادات و معاملات سے متعلق ہوتا تھا ۔ اس طرح دونوں بزرگوں کے تعاون سے اسلام کی واضح تصویر نئی نسل کے دل میں جاگزین ہو جاتی ۔ اس دور میں آج کل کے نوجوانوں کی طرح طلبہ مذہب سے باغی اور سرکش نہ تھے، بلکہ مذہب میں ان کی دلچسپی اور شوق کا اندازہ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم کے الفاظ میں حسب ذیل ہے[۱۵] :

ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم بھی ان دنوں اسی کالج میں زیر تعلیم تھے ۔

"کالج کے زمانے میں ہفتہ وار وعظ کا انتظام تھا ۔ علوم مشرقیہ کے اساتذہ باری باری سے وعظ کہتے تھے ۔ طلبہ سب سے زیادہ مولانا کے پرمغز وعظ

کو پسند کرتے تھے - اس میں کچھ مبالغہ نہیں کہ بعض طلبہ کو ان کے مواعظ حسنہ کے سننے کا شوق ہی کالج کے ایک درجہ کے بعد دوسرے درجے میں کشاں کشاں دوبارہ کالج میں لاتا تھا -''

اس زمانے میں انجمن حمایت اسلام نے خلیفہ شجاع الدین مرحوم کے دادا قاضی خلیفہ حمید الدین مرحوم کی یاد میں مدرسہ حمیدیہ کے نام پر ایک دینی ادارہ قائم کیا تھا - جس کا مقصد علمائے دین کی ایک بے لوث خدمت کرنے والی جماعت کا تیار کرنا تھا - جو اسلام کی نشر و اشاعت کی خدمت انجام دے سکے - مولانا مرحوم اس مدرسہ میں بھی اعزازی طور پر درس و تدریس کی خدمت بجا لاتے رہے - علاوہ ازیں انجمن نعمانیہ ہند لاہور میں بھی طالبان رشد و ہدایت اور علم و عرفان کے پیاسوں کو سیراب کرتے رہے - مختصراً یوں سمجھنا چاہیے کہ کالج کی ملازمت کے پردے میں آپ کو تبلیغ اسلام کے فریضہ کو بجا لانے کا بہت اچھا موقع ملتا رہا -

اخلاق و عادات

مولانا مرحوم زندگی کے ہر پہلو مثلاً لباس ، خوراک ، گفتگو ، نشست و برخاست وغیرہ میں حتی الوسع سنت نبوی ؐ کو ملحوظ خاطر رکھتے تھے - ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم اپنے مضمون یاد ایام میں لکھتے ہیں[۱۶] :

'' مولانا روحی کو فارسی اور عربی زبان اور ادب میں تبحر کے علاوہ علوم جدیدہ سے بھی واقفیت حاصل تھی - صاحب علم بھی تھے اور صاحب عمل بھی - دانش مند ، درویش صفت ، جن کے اخلاق نیک مردوں کے تھے - پرانے بزرگوں کی طرح ان کی زندگی جوار مسجد میں گزری - ہر طرح کی سادگی سے آراستہ اور ہر طرح کے تکلفات سے بری''-

کالج جاتے وقت یا کسی مجلس میں شرکت کے موقع پر شلوار ، قمیص اور لمبے کوٹ کے اوپر سفید ململ کا چغہ استعمال کرتے اور پگڑی کے نیچے کلاہ پہنتے - پاؤں میں اپنے گاؤں کا بنا ہوا یا چھتا بازار رنگ محل سے خریدا ہوا جوتا پہنتے - گھر سے نکلتے وقت ہاتھ میں ایک موٹا سا عصا رکھتے جو بقول خضر تمیمی[۱۷] مرحوم ہما شما سے بآسانی اٹھایا نہ جا سکتا تھا - گھر پر ململ کا دیدہ کرتا اور کھدر کی چادر بالالتزام اوڑھتے - موسم سرما میں گرم یا روئی دار واسکٹ کا اضافہ فرماتے - جمعہ کے روز نماز سے پہلے حجامت بنواتے اور استرے سے سر منڈوا دیتے - سنت نبوی ؐ کی پیروی میں مونچھوں کو ترشواتے اور مٹھی بھر داڑھی سے زائد وہ کٹوا دیتے - داڑھی کو مہندی سے خضاب کیا کرتے تھے -

خوراک کے معاملے میں بھی وہ ''خوردن برائے زیستن'' کے قائل تھے۔ وہ کبھی کسی کھانے میں نقص نہ نکالتے۔ اگر کوئی کھانا ناپسند بھی ہوتا تو بغیر سالن کے ہی روٹی کھا لیتے۔ پھلوں میں گنا، خربوزہ اور آم انھیں بہت مرغوب تھے۔ چنانچہ جب ان پھلوں کا موسم آتا تو بار بار میوہ منڈی کسی کو بھیج کر کافی مقدار میں یہ پھل منگواتے اور اہل خانہ میں تقسیم فرماتے۔ چونکہ روزانہ مسواک کرنے کے عادی تھے اس لیے آخر وقت تک ان کے تمام دانت بالکل صحیح کام کرتے رہے۔ اور گنا چوسنے میں بھی انھیں کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔ حقہ نوشی کی انھیں پختہ عادت تھی مگر تلخ تمباکو کو پسند کرتے تھے۔ ان کے تلامذہ اور احباب کو چونکہ ان کے اس شوق کا پتہ تھا اس لیے اچھی قسم کے تمباکو اور حقے سوغات کے طور پر لاتے رہتے تھے۔

ریاء اور نام و نمود کے کاموں سے انھیں سخت نفرت تھی۔ ملازمت کے دوران ایک عقیدت مند نے انھیں کلائی کی گھڑی بطور تحفہ پیش کرنا چاہی۔ مگر آپ نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ مجھے یہ نمائشی چیز پسند نہیں ہے۔ شہرت حاصل کرنے کا خیال ان کے دل میں کبھی پیدا نہ ہوا تھا۔ ان کے فرزند ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ آپ نے عربی اور فارسی میں اتنے شعر کہے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ان کو طبع کروا لیا جائے فرمانے لگے میں اپنی زندگی میں اپنی شہرت نہیں چاہتا۔ میرے بعد اگر کسی کو ضرورت ہوئی تو میں اس کی اجازت دیتا ہوں۔

خوش طبعی اور ظرافت ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ وہ بعض مذہبی علماء کی طرح یبوست کا شکار نہیں تھے بلکہ زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ چنانچہ ان کے ایک شاگرد غلام علی صاحب[۱۸] نے جو جھنگ میں ضلع کچہری کے ملازم تھے ایک دفعہ اصرار کرکے انھیں جھنگ لے جانے پر آمادہ کر لیا اور وہاں ایک جلسہ میں تقریر کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ جھنگ کا ریلوے اسٹیشن ابھی تعمیر نہیں ہوا تھا اس لیے گاڑی سے اتر کر کافی فاصلہ تانگے کے ذریعے طے کرنا پڑتا تھا۔ راستہ بھی کچا تھا اور قدم قدم پر گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ بار بار ہچکولے لگنے کی وجہ سے آپ کو سخت کوفت ہوئی۔ منزل مقصود پر پہنچ کر جب معتقدین مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوئے تو فی البدیہہ بے ساختہ یہ شعر آپ نے موزون کر دیا:

فلک می داشت با رومی سر جنگ
کہ آوردش بتانگہ جانب جھنگ

حاضرین مجلس یہ سن کر ہنس پڑے ۔

ایک دن ایک صاحب جو عموماً ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے تشریف لائے اور کہنے لگے کہ میں نے اپنا پہلا مکان جو بہت خستہ حالت میں تھا چھوڑ کر ایک اور مکان کرائے پر لے لیا ہے جو پہلے کی نسبت بہت کشادہ اور ہوا دار ہے ۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا وہ منجل اور منلک ہے یا نہیں ۔ یہ نامانوس اور ثقیل الفاظ سن کر وہ صاحب سوچ میں پڑ گئے اور عرض کیا ، حضرت میں ابھی آپ کی بات سمجھ نہیں سکا ۔ دوبارہ ارشاد فرمائیے ۔ آپ نے پھر وہی الفاظ دہرائے ۔ لیکن ان کے پلے کچھ نہ پڑا اور بات کی وضاحت چاہی ۔ فرمانے لگے میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ اس مکان میں بجلی اور نلکے کا انتظام ہے یا نہیں ؟ یہ سن کر وہ صاحب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے اور بار بار ان الفاظ کو دہرا کر مزہ لیتے رہے ۔

عبدالبشیر آذری صاحب[۱۹] بیان کرتے ہیں کہ

''میں ایک دن استاد گرامی کے دولت کدے پر حاضر ہوا ۔ ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی ۔ اتنے میں گھر کی صفائی کرنے والی مہترانی آ گئی ۔ اسے دیکھ کر اس سے پوچھنے لگے ، اری او کنامہ کیا تیرے قریہ میں بھی ایسے ہی تقاطر و تماطر ہوتا ہے ۔ وہ بیچاری اس کا کیا مطلب سمجھتی ۔ فرمانے لگے تو فہم و ادراک کرے یا نہ کرے لیکن اپنا انداز تخاطب علی ہذا القیاس ہی رہے گا ''۔

آپ کے اکثر شاگردوں نے روایت[۲۰] کی ہے ، جن میں عبدالبشیر آذری اور مولانا غلام رسول مہر صاحبان بھی شامل ہیں کہ استاد گرامی سردیوں کے موسم میں ہمیں ایک دفعہ کالج گراؤنڈ میں درس دے رہے تھے ۔ ایک سپیرا آیا اور بین بجانے لگا تو استاد گرامی نے اس سے پوچھا کیا چاہتے ہو ؟ اس نے جواب دیا جناب میرے پاس کچھ کیڑے (سانپ) ہیں جو میں آپ کو اور آپ کے شاگردوں کو دکھانا چاہتا ہوں ۔ اس نے ایک ایک کرکے کئی سانپ دکھائے ۔ آپ بڑی دلچسپی سے انھیں دیکھتے رہے ۔ پھر ایک سانپ کے بارے میں آپ نے پوچھا کہ یہ کس نوعیت کا ہے ۔ سپیرے نے جواب دیا ۔ جی یہ کالر کے علاقے میں پایا جاتا ہے ، میں کل ہی اسے پکڑ کر لایا ہوں ۔ فرمانے لگے ، یہ عجیب نا معقول شخص ہے ۔ میں اس کی نوعیت پوچھتا ہوں اور یہ اس کی ظرفیت بتا رہا ہے ۔ اس پر وہ سپیرا اٹھ کھڑا ہوا ۔ اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا ۔

ایک دفعہ مولانا[۲۱] موسم گرما کی تعطیلات میں اپنے گاؤں میں قیام پذیر تھے کہ گجرات کے ڈپٹی کمشنر خان بہادر خورشید محمد اپنے عملہ کے چند آدمیوں کے ساتھ سرکاری دورہ پر ادھر آ نکلے ۔ طالب علمی کے زمانے میں مولانا نے ان کا نام ''لگڑ بگڑ'' رکھ چھوڑا تھا ۔ جب انھیں پتہ چلا کہ آج کل استاد گرامی یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں تو وہ اپنے ماتحت عملہ اور گاؤں کے بعض سربرآوردہ باشندوں کے

ساتھ ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ اس وقت حالانکہ وہ ایک بہت بڑے افسر تھے اور ان کی عمر بھی ۵۰ سال سے زیادہ ہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود مولانا نے حسب معمول ان سے مصافحہ کیا۔ پھر ان کی گوشمالی کرنے کے بعد گردن پر دو تین چپت لگائے۔ وہ اس دوران عقیدت مندانہ طور پر گردن جھکائے کھڑے رہے۔ جب مولانا نے انہیں لگڑ بگڑ بچہ کہہ کر مخاطب کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور پوچھنے لگے کہ آپ کو آج تک میرا نام کیسے یاد رہا؟

اس طرح کے اور بھی کئی لطائف پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن مضمون کی طوالت کے خوف سے انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

وفات

آپ کی وفات ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ بمطابق ۳۱ مئی ۱۹۵۴ء کو ہوئی۔ کافی مدت صاحب فراش رہ چکے تھے اور مسجد میں آمد و رفت ترک ہو گئی تھی۔ گھر پر ہی تخت پر، بعض وقت چارپائی پر ہی نماز ادا کر لیتے تھے۔ چنانچہ ان کے سب سے بڑے صاحبزادے مولوی فضل حق مرحوم سرکاری دورے پر کراچی سے پشاور جاتے ہوئے راستہ میں اپنے والد ماجد سے ملاقات اور زیارت کے لیے لاہور ٹھہرے ہوئے تھے۔ عصر کی نماز کا وقت ہوا تو مولانا نے ان سے کہا کہ مجھے مصلی پر بٹھا دو تاکہ میں نماز ادا کر لوں۔ ان کے صاحبزادے نے حکم کی تعمیل کی اور مولانا نماز پڑھنے لگے۔ نقاہت کی وجہ سے قیام سے معذور تھے۔ اس لیے بیٹھ کر ہی نماز پڑھ رہے تھے۔ دو رکعت ادا کرنے کے بعد انہوں نے سلام پھیر دیا تو صاحبزادہ نے کہا کہ ابا جان آپ کو تو چار رکعت پڑھنی چاہئیں تھیں کیونکہ یہ عصر کی نماز ہے۔ لیکن آپ نے ہاتھ کے اشارے سے ذرا صبر کرنے کے لیے کہا۔ اس کے بعد وہ اسی تخت پر لیٹ گئے اور ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ بعد میں مجھے خیال آیا کہ چونکہ آپ عالم آخرت کو سفر کرنے والے تھے اس لیے آپ نے نماز قصر یعنی چار کی بجائے دو فرض ادا کیے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا کے منجھلے صاحبزادے ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی نے ان کی وفات کی کئی تاریخیں نکالیں جن میں سے ایک حسب ذیل ہے۔ جو مولانا مرحوم کے مزار پر کندہ ہے:

بیدار چو شد فتنہ و چون امن بخفت
روحی ز جہان زیر زمین روے نہفت
تاریخ وفاتش چو ز ہاتف جستم
سہ یوم چو ماندہ ز مہ رمضان، گفت

۱۳ ۵ ۷۳

وفات کے اگلے دن بھاٹی دروازہ کے باغ میں آپ کی نماز جنازہ پڑھی گئی جس میں امامت کے فرائض جامعہ فتحیہ کے ایک استاد مہر محمد مرحوم نے ادا کیے اور آپ کو محلے کے تکیہ نیاریاں میں امانت کے طور پر دفن کیا گیا کیونکہ آپ کے تمام فرزندان ملازمت کے سلسلے میں ایک ایک دو دو دن کی رخصت پر آئے ہوئے تھے چنانچہ چند ماہ کے بعد جب موسم گرما کی تعطیلات ہوئیں تو آپ کی وصیت کے مطابق آپ کے تابوت کو وہاں سے نکال کر آپ کے آبائی وطن کٹھالہ میں سپرد خاک کیا گیا ۔ آپ نے ریلوے سٹیشن کے قریب ہی شاہراہ اعظم (جی ٹی روڈ) کے کنارے ایک مسجد بنوا رکھی تھی تاکہ آتے جاتے راہ گیر وہاں نماز ادا کو سکیں ۔ آپ بار بار اہل خانہ سے یہ کہتے رہے تھے کہ مجھے اس کے قریب دفن کرنا چنانچہ ایسا ہی عمل میں آیا ۔

تصنیفات و تالیفات

ملازمت ، امامت و خطابت ، درس و تدریس ، تبلیغ اور عبادت و ریاضت کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود تصنیف و تالیف کی طرف بھی مولانا مرحوم نے اپنی توجہ مبذول فرمائی اور مختلف موضوعات پر متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں ۔ صاحب مراۃ التصانیف کے بیان کے مطابق آن کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب کی تعداد پچیس سے زیادہ ہے ۔ ذیل میں آن کی چند ایک اہم تصانیف کا اجمالی تعارف کرایا جاتا ہے :

۱ علم تفسیر

مولانا نے ۲۹ ویں اور ۳۰ ویں پارے کے نصف تک قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو آن کے ماہوار رسالہ ''الھدی'' میں قسط وار مسلسل چھپتی رہی ۔ اس کے علاوہ سورۂ یاسین کی تفسیر بھی تصنیف کی جو مکتبہ علمیہ لاہور سے شائع ہو چکی ہے ۔

۲۔ علم کلام و عقائد

اس موضوع پر آن کی سب سے بڑی کتاب ما فی الاسلام ہے جو دو جلدوں میں آن کی زندگی ہی میں لاہور میں شائع ہوئی ۔ دونوں جلدیں ۱۲ے اور ۴۸۳ صفحات پر بالترتیب مشتمل ہیں ۔ اس میں انگریزی خواں نوجوان بچوں کے عقائد کو صحیح اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ۔ اپنی چالیس سالہ کالج کی ملازمت کے دوران انگریزی خواں طالب علم مذہب کے بارے میں مختلف قسم کے شکوک و اوہام مولانا کے سامنے پیش کرتے رہتے تھے جن کا جواب آنہیں تسلی بخش طور پر دے دیا جاتا ۔ تمام ضروری عقائد اور بعض مسائل

جدیدہ کا ذکر جو آجکل زیر بحث رہتے ہیں اس کتاب میں بخوبی کیا گیا ہے ۔ مثلاً حکم پردہ ، حرمت سود، تعلیم نسواں، بیمہ زندگی ، لاٹری وغیرہ۔ ہر انگریزی خواں مسلمان نوجوان کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے ۔

اسی موضوع پر عقائد سے تعلق رکھنے والی ایک اور تصنیف تذکرۃ الموتیٰ و القبور ہے یہ ہندوستان میں طبع ہو چکی ہے۔ اسی طرح ''تقدیر و تدبیر'' کے موضوع پر بھی ایک رسالہ ''التنویر فی اسقاط التدبیر'' بھی آپ نے لکھا جو قسط وار ماہنامہ الھدیٰ میں چھپتا رہا۔

۳۔ علم تصوف

اس سلسلے میں آن کی ایک کتاب ''الآیۃ الکبریٰ فی شرح الاسماء الحسنیٰ'' ہے ۔ جو ۲۴۸ صحفات پر آن کی زندگی میں طبع ہو گئی تھی ۔

ایک اور کتاب ''اسرار التنزیل'' ہے جو زیادہ تر مسئلہ وحدۃ الوجود کی بحث پر حاوی ہے ۔ یہ بھی الھدیٰ میں قسط وار شائع ہوئی ۔

ایک اور رسالہ امام غزالی کی کتاب نصیحۃ التلمیذ کا اردو ترجمہ ہے جس کا نام نعم التعویذ العالی ہے ۔ یہ بھی آپ کی زندگی میں طبع ہوئی ۔

تصوف سے تعلق رکھنے والی ایک اور کتاب ''الجفاء و الوفاء'' ہےجو ابن قیم کی عربی کتاب کا اردو ترجمہ ہے ۔ یہ بھی آپ کی زندگی میں چھپ گئی تھی ۔

حکمت بالغہ کے نام سے بھی آپ کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جو ایک دفعہ تو آپ کی زندگی میں چھپا اور دوسری بار آج سے چند سال پہلے مکتبہ خلیل کی طرف سے طبع ہوا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعض حکیمانہ اقوال (جو زیادہ تر ''نہج البلاغۃ'' سے لیے گئے ہیں) کی شرح ''امیر الکلام من کلام الامام'' کے نام سے آپ کی زندگی ہی میں چھپ گئی تھی ۔

امام بوصیری کے قصیدۂ بردہ کی اردو شرح جس کا نام ''اطباق الثردہ فی حل ابیات البردۃ'' ہے بھی آپ کے سامنے ہی طبع ہو گئی تھی ۔

۴۔ علم بلاغت و عروض

اس موضوع پر آپ نے فارسی فصیح زبان میں چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل ایک کتاب دبیر عجم کے نام سے تصنیف کی جو آپ کی زندگی میں دو دفعہ طبع ہوئی ۔ اس کتاب پر ریاست حیدر آباد کے والی نے انہیں انعام بھی دیا تھا اور اس کتاب کو پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات ایم ۔ اے (فارسی) و منشی فاضل اور

ریاست حیدر آباد کے اعلیٰ فارسی امتحانات کے لیے نصاب بھی مقرر کر لیا تھا ۔ پنجاب یونیورسٹی کے اعلیٰ فارسی امتحانات میں اس کو اب بھی کتب مجوزہ میں درج کیا گیا ہے ۔

دبیر عجم کا حجم چونکہ کافی بڑھ گیا تھا اس لیے آپ نے علم عروض کو الگ ایک کتاب میں دبیر عجم کے تتمہ کے طور پر جمع کیا لیکن اسے فارسی کی بجائے اردو میں لکھا ۔ ہاں مثالیں فارسی کلام سے دی گئیں ۔

۵۔ علم فلسفہ

شیخ بو علی سینا کی کتاب اشارات اس موضوع پر نہایت مشکل اور دقیق کتاب ہے کسی زمانہ میں یہ کتاب مولوی فاضل کے کورس میں داخل تھی ۔ چنانچہ جب اُن کے سب سے بڑے صاحبزادے مولوی فضل حق نے مولوی فاضل کا امتحان دیا تو مولانا انہیں اُس کتاب کی امالی اور حواشی قلمبند کرا دیا کرتے تھے ۔ بعد میں امیدواران امتحان مولوی فاضل کی سہولیت کی خاطر اُن کے صاحبزادے نے ان حواشی کو طبع کرا دیا اور اس کا نام ''تجلیات'' رکھا ۔

۶۔ علم تاریخ و سیر

اس موضوع پر نبی کریمؐ کے خلفاء کے حالات رسالہ الھدیٰ میں چھپنے شروع ہوئے تھے ۔ چنانچہ حضرات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے حالات مکمل ہو چکے تھے بلکہ کچھ حالات حضرت عثمان کے بھی چھپ چکے تھے ۔ کہ الھدیٰ چھپنا بند ہو گیا اور یہ موضوع نامکمل رہ گیا اس موضوع کا عنوان ''عظماءالاسلام'' تھا ۔

۷۔ مناظرہ اور رد عقائد باطلہ :

اس موضوع پر اسلام اور عیسائیت کے نام سے قسط وار رسالہ الھدی میں مضامین چھپتے رہے ۔ یہ دراصل ایک عیسائی پادری کے رسالہ ''ینا بیع الاسلام'' کا رد تھا ۔ جس میں اُس نے اسلام پر کچھ اعتراضات کیے تھے ۔ اسی طرح ایک اور مضمون سالوس مقدس کی توحید پر تنقید بھی رد عیسائیت سے متعلق اُن کے مقالات کا مجموعہ ہے ۔

عیسائیت کے رد میں اُن کا ایک اور رسالہ ''سیطرۃ الاسلام علی النصاریٰ اللئام'' ہے جو انہی دنوں میں چھپ گیا تھا ۔

عقائد باطلہ کے رد میں اُن کا ایک اور رسالہ اتمام الحجہ علی من اعرض عن المحجہ ہے جو اہل تشیع اور کچھ مرزائیت کے بارے میں ہے ۔ یہ بھی الھدیٰ میں قسط وار چھپتا رہا ۔

اس کے علاوہ اُن کے بہت سے قابل مطالعہ مقالات اور خطبات ہیں جو نہایت تحقیق سے لکھے گئے ہیں ۔ وہ ایک جگہ جمع نہیں کیے جا سکے کچھ تو اُن کے رسالہ الھدیٰ میں اور کچھ انجمن حمایت اسلام کے ماہوار رسالہ میں موجود ہیں ۔ رسالہ الھدیٰ محض عقائد باطلہ کی تردید اور تعلیمات حقہ کی تبلیغ کی خاطر دس سال اُن کی زیرادارت طبع ہوتا رہا ۔

مندرجہ بالا کوائف میں نہایت اختصار سے کام لیا گیا ہے چونکہ وقت تنگ ہے اس لیے تفصیل میں جانا مناسب نہ تھا ۔ تاہم ان کوائف سے یہ پتہ تو چل جاتا ہے کہ مولانا مرحوم ہر وقت اپنے آپ کو دینی اور علمی خدمات میں مشغول رکھتے تھے ۔ اور محنت سے گھبرانے کی بجائے اُس میں دلچسپی لیتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دین و دنیا دونوں کو بوجہ احسن کامیابی کے ساتھ چلاتے رہے اور ہر طبقہ کے لوگ اب تک اُن کا کلمہ پڑھتے ہیں ۔ فغفر لہ اللہ ۔

حواشی

۱۔ منشی محمد دین فوق کشمیری ، علامہ عبدالحکیم کی سوانح عمری ص ۱۰۶ پر لکھتے ہیں کہ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں دریائے چناب کے پار سے ڈاکو اور راہزن آتے تھے اور چھاپہ مار کر چلے جاتے تھے ۔ حکام سیالکوٹ جن کے ماتحت وہ علاقہ تھا اُن کے انتظام سے عاجز تھے ۔ شہنشاہ اکبر جب ۹۹۴ھ کے بعد سفر کشمیر سے واپس آیا اور بھمبر کے قرب و جوار کے لوگوں نے گوجروں کی لوٹ مار کی شکایت کی تو اکبر نے گجرات کے نام سے ایک گاؤں آباد کیا جہاں سیالکوٹ سے بھی بہت لوگ آ کر آباد ہوئے اور اس گاؤں کو جس میں گوجروں کی آبادی دیگر تمام اقوام سے زیادہ تھی ، سیالکوٹ سے بالکل الگ کر دیا ۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے گجرات اور سیالکوٹ کے اضلاع الگ الگ نہیں تھے بلکہ دریائے چناب کے دونوں جانب کا علاقہ ضلع سیالکوٹ ہی کہلاتا تھا ۔ دونوں ضلعوں کی الگ الگ حد بندی شہنشاہ اکبر کے زمانے میں ہوئی ۔ اس بات کی تائید ڈاکٹر قریشی احمد حسین احمد قلعداری کی کتاب گجرات بعہد قدیم و جدید (ص ۳۸) سے بھی ہوتی ہے ۔

۲۔ اس گاؤں کی وجہ تسمیہ کے بارے میں پرانے بزرگوں سے دو روایات منقول ہیں ۔ پہلی یہ کہ یہ گاؤں اپنے آس پاس کے باقی دیہات کی نسبت بڑا اور اہم

تھا کیونکہ موجودہ جی ٹی روڈ (جسے جرنیلی سڑک کہا جاتا تھا) کے کنارے پر آباد ہے اور ریلوے سٹیشن بھی ہے اس لیے گزشتہ زمانے میں لوگوں کے معاملات طے کرنے کے لیے تمام دیہات کے لوگوں کا اجتماع اسی گاؤں میں ہوا کرتا تھا ۔ گویا اصل میں یہ لفظ اکٹھ والا (پنچایت کے اکٹھا ہونے کی جگہ) تھا ۔ کثرت استعمال سے کٹھالہ بن گیا ۔ دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ دریائے چناب کے دائیں کنارے پر واقع ہونے کے باعث یہاں لکڑی (کاٹھ) کی بہت بڑی منڈی تھی ۔ جو لکڑی پہاڑی علاقے سے دریا کے رستہ بہہ کر آتی تھی ، اسے یہاں اکٹھا کر لیا جاتا تھا اس لیے اصل میں اس کا نام کاٹھ والا تھا جو بولتے بولتے کٹھالہ بن گیا ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔ اب دریا سے پکڑی جانے والی لکڑی کٹھالہ کی بجائے ایک چھوٹے سے سٹیشن ''ہری پوربند'' میں جمع کی جاتی ہے کیونکہ دریائے چناب پہلے بالکل کٹھالہ کے قریب بہتا تھا جیسا کہ ریلوے لائن کٹھالہ کے نیچے پل کے باقی ماندہ نشانات سے پتہ چلتا ہے پھر دریائے چناب کا رخ موڑ کر آبادی سے قریباً ایک میل کے فاصلے تک دور کر دیا گیا ۔

۳- یہ تمام کوائف پنجاب یونیورسٹی کے کیلنڈر متعلقہ ۹۷-۱۸۹۶ء (ص ۲۸۴-۳۰۵) ۔ اور Report on the operation of the Punjab University 1891 کے صفحہ ۷ کے علاوہ بعض اُن اسناد سے حاصل کیے گئے ہیں جو مولانا مرحوم کے اہل خاندان کے پاس موجود ہیں ۔

۴- مقالات دینی و علمی ، حصہ دوم ، ص ۱۴۲ ۔

۵- ایضاً ، ص ۱۴۱ ۔

۶- مکتوب مولوی ضیاء محمد بنام راقم ۔

۷- مضمون ''لاہور کا چیلسی'' مطبوعہ ماہنامہ نقوش ۔

۸- کتاب ''اسلام زندہ باد'' از عبدالمجید قریشی ، ص ۲۰-۲۲ ۔

۹- اقبال نامہ (مجموعہ مکاتیب اقبال) از شیخ عطاء اللہ ، ص ۹۷ ۔

۱۰- مجلہ ضیائے حرم اپریل ۱۹۷۵ء از پیر محمد کرم شاہ ۔

۱۱- مکتوب محمد شفیع بنام راقم ۔

۱۲- مکتوب مولانا غلام رسول مہر بنام ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی ۔

۱۳- مکتوب مولانا علم الدین سالک بنام ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی ۔

۱۴- مکتوب شاہ صاحب بنام راقم ۔

۱۵- مقالات دینی و علمی ، حصہ دوم ، ص ۱۴۱ -

۱۶- ایضاً ، ص ۱۴۰-۱۴۱ -

۱۷- مکتوب خضر تمیمی بنام ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی -

۱۸- مکتوب حافظ محمد شفیع پسر غلام علی صاحب بنام ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی -

۱۹- مکتوب عبدالبشیر آذری بنام راقم -

۱۰- مکتوب عبدالبشیر آذری و مولانا غلام رسول مہر -

۱۲- یہ روایت مولانا کے فرزند ڈاکٹر رانا بہاء الحق نے بیان کی -